M.A.URDU/SEM-2, CC-IX/ BY DR. TAUQEER ALAM

تحقیق

تحقیق کے اصطلاحی معنی کسی موضوع کے سائنٹفک مطالعہ کے ذریعہ کچھ حقائق کو دریافت کرنا ہے جہاں تک سائنس کا تعلق ہے وہاں تحقیق کا مقصد صرف یہ ہے کہ کسی خارجی حقیقت کے بارے میں کوئی نئی بات دریافت کی جائے جس سے علم انسانی میں اضافہ ہو۔ادب میں تحقیق کسی ادب پارے کی جانچ پڑتال کا نام ہے۔اس جانچ پڑتال میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم زیر نظر ادب پارے کی تاریخی حیثیت پر بحث کرتے ہیں اور یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے حسن وقبح کو پرکھتے ہیں۔اس طرح کبھی تو لفظ تحقیق جنرل ریسرچ کے معنی میں آتا ہے اور ریسرچ کے دونوں پہلوؤں پر حاوی ہوتا ہے اور کبھی تنقید کے مقابل استعمال ہوتا ہے۔اور صرف ایک پہلو کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ ریسرچ کا اصل تعلق ذہنی عمل Mental Process سے ہے اور یہ ذہنی عمل جب اپنا اظہار کرتا ہے تو اس سے تخلیق (Creative work) تحقیق (Research) اور تنقید (Criticism) وجود میں آتی ہے۔ادبی تخلیق زندگی کی ترجمان اور تحقیقی وتنقید ادب کی ترجمان ہوتی ہے۔تحقیق وتنقید میں ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہوئے بھی یہ فرق ہے کہ اول الذکر میں کسی ادبی شاہکار کی تاریخی حیثیت نمایاں رہتی ہے اور موخرالذکر میں جمالیاتی (Aesthetic) دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ تخلیق ایک پیکر تراشی ہے اور تحقیق اس کے مواد (Material) سے بحث کرتی ہے اور تنقید اس پیکر کی اچھائی برائی کا اظہار کرتی ہے۔مثال کے طور پر دیوان غالب ایک بڑے شاعر کی تخلیق ہے اب اس سلسلہ میں اس بات کا کھوج لگانا کہ دیوان غالب پہلی بار کب ارکہاں شائع ہوا،کون سی غزلیں واقعی طور پر شاعر کی ہیں؟ اور کون سی غزلیں الحاقی ہیں،کس شعر کی صحیح قرأت (Reading) کیا ہے؟ دوسرے نسخوں کا اختلاف کس حد تک ہے؟ اور ان میں کس کو اور کیوں ترجیح دی جائے؟ یہ تحقیق کا فرض ہے۔اس کے برخلاف تنقید کا کام یہ ہے کہ اس بات کا پتا لگائے کہ شاعر نے کون سا خیال کس دور سے شاعر سے متاثر ہوکر یا کس جذبہ سے مغلوب ہوکر ادا کیا ہے اور ایسا کرنے میں وہ کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔اس کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ تنقید یہ دیکھتی ہے کہ فلاں شاعر کے خیالات کی محرک کون سی نفسیاتی یا ذہنی کیفیت ہے اور نیز ان خیالات یا ان کے اظہار میں کس حد تک حسن کاری پائی جاتی ہے۔اس کے کلام کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات طے کی جاسکتی ہے کہ وہ کون سی فضا ہوسکتی ہے جس کے تحت ہم اس کی تخلیقات کا مطالعہ کریں اور کن صفات کو اس کے کلام کی خصوصیت قرار دیں۔

ادبی حوالے سے 'تحقیق' (Resaerch) کو ہمیشہ ایک فن تسلیم کیا گیا ہے اور تحقیق کار کے لئے فنی اصطلاح 'محقق' مدتوں رائج رہی ہے۔اس کا ایک سبب یہ تھا کہ تحقیق کے ماحصل ہی کو 'تحقیق' قرار دیا جاتا رہا اور طریق کار کو تحقیق کا نام دینا غیر ثقہ امر سمجھا گیا۔یہی وجہ ہے کہ 'تحقیق کار' کا نام اور 'تحقیق' کو 'فن' کا درجہ حاصل تھا۔جدید علم تحقیق کی روشنی میں اس روش کو پذیرائی حاصل نہیں ہوسکتی۔

اگر ہم علم کی ماہیئت پر غور کریں تو ہمیں تحقیق کے فن ہونے پر معترض ہونے کا حق حاصل ہوجاتا ہے۔ادبی دنیا میں تنقید اور تحقیق کے شعبوں کو ان کی نگارشات کے حوالے سے ہمیشہ اسلوبیات کے دائرہ کار میں لانے کی کوشش کی گئی۔تنقیدی مضامین اور اس کی آڑ میں تحقیقی مقالات کو بھی ادب کی شاخ سمجھا گیا اور چونکہ ادب فن پارے کی حیثیت رکھتا ہے اور علم کی بجائے فن کی ذیل میں آتا ہے۔اس لئے علم تحقیق کو بھی پہلے قدم کے طور پر فن ہی قرار دیا گیا۔

مراحل کے لحاظ سے علم کی بنیاد میں کارفرما دو امور سمجھنا ضروری ہوتے ہیں۔ایک یہ کہ علم ہمیشہ تشکیک سے شروع ہوتا ہے اور دوم یہ کہ ظن وتخمین پر اکر منتج ہوتا ہے جبکہ یقینی معلومات اور حقائق کا ادراک انسان کو ایمان ویقین کی منزلوں تک لے جاتے ہیں۔ظن وتخمین نئے شکوک وشبہات کو جنم دیتے ہیں اور ایمان وعقائد انسانی ذہن کو احقاق حق کی منزل پر لے آتے ہیں۔شکوک وشبہات انسان کو پرکھ پرچول اور احقاق ویقین تسلیم ورضا کے لئے مجبور کرتے ہیں۔تحقیق پرکھ پرچول کا دوسرا نام ہے اور مسلمات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔اس لئے تحقیق صرف غیر مسلمہ حقائق پر انجام دی جاتی ہے یعنی جن امور پر شک کیا جاسکتا ہو۔صرف انہیں پر تحقیق انجام دی جاسکتی ہے۔ادبی ولسانی تحقیقی کام کرنے والوں کو یہ بات شروع ہی سے پیش

نظر رکھنی چاہئے کہ تحقیق ایک باضابطہ، تعقلی اور تجربی طریقہ ہے جس سے مسائل کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر احسان اللہ خان اور ڈاکٹر عبدالرشید آزاد تحقیق کو باقاعدہ اور عمیق تجزیاتی منظم طریق کار یا سرگرمی قرار دیتے تھے۔ مجموعی طور پر ہم تحقیقی ایسے باضابطہ طریق کار کو کہہ سکتے ہیں جو حقائق کی دریافت، باز دریافت اور تقابلی طور پر حدودِ علم کی توسیع کا سبب بنے۔ گویا تحقیق نتیجہ نہیں طریق کار ہے۔

تلاش، تفتیش اور تحقیق ایک پہلو سے مترادف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن جب ہم تحقیقی میدان (Discipline) کی بات کرتے ہیں تو تلاش اور تفتیش اس کے ذیلی اجزا قرار پاتے ہیں۔ تحقیق کا مقصد محض صداقت کی تلاش اور حقائق کی تفتیش یا بازیافت نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایک نہایت ذمہ داری، دقتِ نظری اور ریاضت کا کام ہے۔ بعض کے نزدیک تحقیق سوال کرنے اور اس کا معروضی جواب پانے کا نام ہے۔ بعض کے نزدیک متغیرات (Variables) اور کارکردگی کی پیمائش میں تعلق معلوم کرنے کو تحقیق کہتے ہیں۔ بعض اس کے طریق کار اور بعض حاصلات کو تحقیق کا نام دیتے ہیں۔ جبکہ تحقیق بعض مفروضات (Assumptions) کے ساتھ تقابل کرتے ہوئے فرضیات (Hypothesese) کے حقائق دریافت کرنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ منظم معروضی مدلل اور کلی ہوتی ہے۔ یعنی تحقیق ایک ایسا طریق کار ہے جو۔ ا منظم (۲ (Organised۔ معروضی (۳(Objective۔ مدلل (Rational) ۴ ۔کلی (Holistic) طور پر انجام پاتا ہے۔

تحقیق صداقت کی معروضی تلاش ہے اور معروضی صداقت صرف وہی نہیں ہوتی جو کوئی ایک شخص موضوعی طور پر جانتا ہو بلکہ ضروری ہے کہ دوسرے بھی اسی کی مانند اس کیفیت کو معروضی طور پر ہی جان سکیں۔ زبان وادب کے شعبے میں تحقیق کھرے اور کھوٹے کی چھان بین یا تصدیق کرنے کو کہا گیا ہے۔ لیکن یہ تلاش اور تصدیق ایک باضابطہ طریق کار یا رسمیات کے مطابق انجام پاتی ہے۔ یہ طریق کار منطقی اور معروضی ہوتا ہے۔ ایسا نہیں جیسا کہ اب تک ادبی شعبے میں سمجھا جاتا رہا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے تنقید اور تحقیق دونوں کو صداقت کی تلاش کا عمل قرار دیتے ہوئے زیادہ بہتر طور پر وضاحت کی ہے۔ ان کے نزدیک:

''صداقت کی تلاش تو بعد الطبیعیات کا بھی اہم مقصد ہے۔ لیکن اس صداقت تک رسائی کا ذریعہ روحانی عمل ہے جب کہ تحقیق میں صداقت تک پہنچنے کا ذریعہ منطقی اور معروضی عمل ہے۔''

جدید تحقیق کو عام طور پر فن، تکنیک یا اصول کے حوالے سے بیان کیا جاتا ہے۔ علم کے لحاظ سے یہ ایک سائنس ہے کیوں کہ اس میں سائنسی طریق کار استعمال ہوتا ہے تاہم جہاں تک اس کے، فنی طریق کار کا تعلق ہے، یہ ایک تکنیک ہے جو چند بنیادی تحقیقی اصولوں پر مبنی ہے اور اپنی پیش کش یا اسلوب کے لحاظ سے یہ ایک فن ہے۔ کیوں کہ استدلال اور بیان فنکارانہ چابکدستی کا تقاضا کرتے ہیں۔

زینا اولیری نے (۲۰۰۴) ہی میں تحقیق کاری پر اپنی کتاب کو اس نقطہ نظر سے پیش کیا ہے کہ تحقیق ایک فکری شغل (Thinking Game) کے ساتھ ساتھ کل ذہنی سرگرمی ہے۔ اس کے خیال میں تحقیق کار کو بنیادی طور پر تحقیقی تخلیقیت سے کام لینا ہوتا ہے جس میں تجزیہ اور فیصلہ ایک مسلسل عمل کی صورت میں ہوتا ہے اور ذہن کو کلی طور پر اس میں مصروف عمل رکھنا ہوتا ہے۔

ادبی ولسانی تحقیق کے حوالے سے تحقیق زبان وادب میں موجود مواد کو از سر نو مرتب کرتی، نئی معلومات کی روشنی میں نئے نظریات وضع کرتی اور نئے نتائج سے زبان وادب کی نئی تاریخ مرتب کرتی ہے۔ اس کا بیشتر مواد ماضی اور تاریخ میں ملتا ہے اور حال پر کام نیز تجزیہ بہت کم پایا جاتا ہے۔ گویا زبان وادب کی تحقیقی تاریخی اور آثار یاتی زیادہ ہوتی ہے اور جائزہ کاری یا بیانیہ اور تجرباتی کم ہوتی ہے۔ اگرچہ سائنسی طریق کار دونوں کے لئے درکار ہوتا ہے۔

تحقیق کا کام نہ تو بے ترتیب طور پر انجام دیا جا سکتا ہے اور نہ یہ کسی واضح منصوبہ بندی کے بغیر وجود میں آ سکتی ہے۔ ایک مخصوص وقت میں انجام دی جانے والی تحقیق کی ایک واضح سمت ہوگی اور اس کے مراحل یا اقدامات متعین ہوں گے۔ یعنی تحقیقی عمل انجام دینے کیلئے کوئی منصوبہ بنایا جائے گا۔ اس منصوبے کا کوئی ڈیزائن ہوگا اور ڈیزائن میں پیش کش کا کوئی خاکہ ہوگا۔

تحقیق انجام دینے سے پہلے تحقیق کار کو یہ علم ہوتا ہے کہ یہ عمل منظم اور ترتیب وار ہے۔ اسے اسی ترتیب کے ساتھ اپنا کام انجام دینا ہوگا۔ اس منظم کام کو مقررہ مدت میں مطلوبہ امور کے تحت مکمل کرنے کے طریق کار کو ہم تحقیقی ڈیزائن کہتے ہیں۔

تحقیقی ڈیزائن تحقیقی سوالات کے جواب کا نام بھی ہے یعنی یہ سوال کہ اس تحقیق کا مقصد کیا ہے؟ آغاز کہاں سے ہوگا؟ منزل کیا ہے؟ اس کے راستے میں کون کون سے مرحلے ہیں اور ان مرحلوں پر موزوں ذرائع، درست مشاہدات اور قابل عتماد آلات کون کون سے ہیں؟ یعنی اس سارے کام کا جواز کیا ہے؟ صحت، وثوق اور امکان کیا ہے؟ اس میں ذاتی رائے کی عدم مداخلت کے امکانات کیا کیا ہیں؟ یہ کتنی مدت میں مکمل ہوگا اور اس پر کتنے اخراجات ہوں گے؟ نیز یہ بھی کہ اس تحقیق کے واقعی انجام پانے کا امکان کس حد تک ہے؟

ایک منظم تحقیق میں مسئلے کی نشاندہی، کوائف کی جمع آوری، تجزیے اور نتائج کی تالیف کا طریق کار پہلے سے طے شدہ اور واضح ہوتا ہے۔ اس کی تنظیم مندرجہ ذیل نکات کی صورت میں یوں بیان کی جاسکتی ہے:

۱۔ تحقیق کا مرکز کوئی مسئلہ ہوتا ہے۔

۲۔ اس میں کوئی نئی بات سامنے آتی ہے۔

۳۔ اس میں کھلے ذہن سے بات کی جاتی ہے۔

۴۔ اس کا انحصار اس مفروضے پر ہے کہ دنیا کو جانا جاسکتا ہے۔

۵۔ اس میں تصورات کو واضح کیا جاتا ہے۔

۶۔ اس میں علت و معلول یعنی سبب اور نتیجے کا رشتہ یا تعلق تلاش کیا جاتا ہے۔

۷۔ اس میں پیمانے استعمال کئے جاتے ہیں۔

۸۔ اسے محض عبوری نتیجے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

ادبی ولسانی تحقیق انجام دینے کے لئے ایسے ہی منظم طریق کار کی ضرورت ہے۔ اگر تحقیقی مقالہ ایسی تنظیم سے عاری ہو تو وہ بادی النظر ہی میں رد کر دینے کے قابل ہوتا ہے، خواہ اس کے نتائج کتنے ہی معتبر اور بہتر ہوں۔ مابعد اثباتیت کا فلسفہ بھی تنظیم پر یقین رکھتا ہے۔ اسی سے تحقیقی ساکھ اور معتبری پیدا ہوتی ہے۔ تاہم اثباتیت جہاں فرضیوں کی تعمیم (Generalization) کی بات کرتا ہے وہاں مابعد اثباتیت امکانات (Possibilities) کا تنظیمی جائزہ بھی لیتی ہے۔ گویا ہر دو صورتوں میں تحقیق منظم طریق کار ہی کا نام ہوگا۔

تحقیق نہایت غیر جانبداری سے انجام دیا جانے والا عمل ہے جس میں ذاتی رائے اور پسند و ناپسند کو دخل حاصل نہیں۔ اسلام میں اسے 'عدل' اور تکنیک میں اسے 'معروضیت (Objectivity) کا نام دیا گیا ہے۔

تجرباتی اور آلاتی تحقیق میں معروضیت یا غیر جانبداری بہ آسانی سمجھ میں آجاتی ہے لیکن دستاویزی تحقیق میں معروضیت کی تلاش اور اطلاق بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ ادبی فن پارے کا حسن یا زبان داں اور ادیب کی سماجی حیثیت، رجحانات اور حدود ان نازک سی معنوی تعبیرات (Connotations) میں موجود ہوتے ہیں۔ جنہیں معروضی گرفت میں لانا دشوار ہوتا ہے۔ فنی کیفیات کا تجزیہ کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔ محض تنقیدی اصول برت کر جو اکثر خود بھی معروضی نہیں ہوتے معروضی نتائج کا نکالنا مشکل ہوتا ہے۔

معروضیت نے تحقیق کی دنیا میں کچھ پیمانے بنا رکھے ہیں مثلاً جب تک

۔ کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو، تحقیق نہیں ہوسکتی۔

۲۔ اس مسئلے کا حل نظر نہ آرہا ہو، تحقیق نہیں ہوسکتی۔

۳۔ یہ ممکنہ حل فرضیوں کے طور پر جانچے نہ جائیں، تحقیق نہیں ہوسکتی

۴۔ تحقیقی نتائج بار بار کی تحقیق سے ایک جیسے نہ آئیں تحقیق مکمل نہیں ہوسکتی۔

۵۔ یہ نتائج صحت، جواز اور وثوق کے لحاظ سے معتبر نہ ہوں تحقیق قبول نہیں ہوسکتی۔

معروضیت میں کوائف یا معلومات کا درست ہونا صحت کہلاتا ہے۔ کوائف اپنے متن، معیار، عصر، تصورات وغیرہ کے لحاظ سے جائز اور موزوں ہوں تو اسے جواز کہا جاتا ہے اور کوائف اپنے نتائج کے لحاظ سے بار بار ایک سے ہوں تو اسے وثوق یا اعتباریت کہا جاتا ہے۔

جدید تحقیق میں معروضیت کا ایک ہی مفہوم ہے کہ اگر کوئی دوسرا شخص یہی تحقیق انجام دے تو اس کے نتائج بھی وہی نکلیں جو پہلے شخص نے برآمد کئے ہیں۔لسانی اور ادبی تحقیق میں بعض ایسے متبدل یا تبدیل ہونے والے عناصر ایسے متغیرات ہوتے ہیں جو تحقیقی نتائج پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ وثوق کی منزل تک پہنچے کیلئے ان متغیرات پر قابو پانا بہت ضروری ہوتا ہے۔ تاریخی تحقیق میں ایک بڑا متغیرہ 'وقت' یا 'زمانہ' ہے۔ جس کی تحدید (Delimitation) عموماً نہیں ہو پاتی۔یعنی اس متغیرے کے اثرات اور امکانات پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔

جدید سائنسی تحقیق میں تو معروضیت کے پیمانے مقرر کئے جا چکے ہیں۔ چنانچہ وہاں تحقیقی ڈیزائن اور پیش کش کے خاکے طے شدہ ہیں۔ادبی ولسانی تحقیق میں معروضیت قائم کرنے کے لئے ہر قدم پر ''عدل'' کی شرط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔خاص طور پر جب پیمائشی رائے مقداری انداز میں دی جا رہی ہو،تو نہ صرف یہ کہ ذاتی تعصب، پسند و ناپسند اس میں شامل نہ ہو، بلکہ مقداری پیمانے اور سکیل مقرر کر لئے جائیں۔ نیز اپنی ان اصطلاحوں کے مفاہیم متعین کر کے پہلے سے بیان کر دئے جائیں جن میں کوئی رائے دی جا رہی ہو۔معروضیت کے بغیر کوئی تحقیق تحقیق نہیں کہلا سکتی۔ اعتبار، اعتماد، موزونیت، وثوق، جواز، صحت، پیمانے پر یہ سب الفاظ معروضیت کے نکات قرار پاتے ہیں۔

اصول تحقیق کا اپنا بھی ایک تنقیدی پہلو ہے جس سے اس کی اصلاح ہوتی رہتی ہے۔ یہ تنقیدی اصول ظاہر کرتے ہیں کہ تحقیق کار کو کوئی شے گمراہ نہیں کر سکتی اور نہ وہ کوائف اور معلومات کو مسخ کرتا ہے بلکہ اس کے طریقوں اور نتائج کی پڑتال ہر کوئی کر سکتا ہے اور انہیں ہر وقت چیلنج کر سکتا ہے۔ یہ خصوصیت اس کی اسی معروضیت کی بنا پر پیدا ہوتی ہے۔

موجودہ ادبی ولسانی مقالات کی ایک بڑی خامی ان کی عدم معروضیت ہے۔یعنی وثوق، جواز، موزونیت اور صحت کے حوالے سے کسی مخصوص ڈیزائن کی پیروی نہ کرنا بڑے سے بڑے تحقیقی کاموں کو پایہ استناد سے گرا دیتا ہے۔

تحقیق میں ہر قسم کی معلومات کے کوائف کو یوں ہی شامل کر کے پیش نہیں کر دیا جاتا۔ انہیں منطقی دلائل کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے جیسا کہ مسلمانوں کی سماجی تاریخ میں موجود تحقیقی کام اسلامی طریقوں، روایت، درایت، جرح و تعدیل کے حوالے سے انجام پاتا رہا ہے۔ یا پھر کسی سند کو صداقت اور عدل کے پیمانوں پر ناپ کر لیا جاتا ہے۔(Authority) پہلا قدم ہے جسے مدلل (Rational) ہونا چاہئے۔ یاد رہے کہ سند بھی زیر انتقاد و تبصرہ ہوتی ہے۔اس لئے سند استعمال کرنے سے پہلے ہمیں دیکھ لینا چاہئے کہ:

۱۔سند خواہ کسی ماہر مضمون کی ہو،اس میں غلطی یا چوک کا امکان موجود ہوتا ہے۔

۲۔سند محض روایات پر مبنی نہ ہو، روایات غلط بھی ہو سکتی ہیں۔

۳۔سند صرف اس لئے درست نہیں کہ اسے ہر آدمی جانتا ہے کہ کیوں کہ عمومیت بے معنی شے ہے۔

۴۔سند صرف اس لئے درست نہیں کہ یہ تسلیم شدہ ہے۔صدیوں کے کئی مسلمات غلط ثابت ہوئے۔

۵۔کسی کے انتقاد، مذہب وغیرہ کو بطور سند استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

۶۔ماہر سے ماہر فرد کی رائے بھی غیر مشروط طور پر تسلیم نہیں ہو سکتی۔

۷۔حوالہ جاتی کتب کی سند بھی حتمی نہیں ہوتی۔

۸۔بلا استدلال کوئی سند تسلیم نہیں کی جا سکتی۔

۹۔غیر عقلی بات بطور سند تسلیم نہیں کی جا سکتی۔

۱۰۔اپنا خیال اور وجدان بطور سند شامل نہیں کر سکتے۔

۱۱۔فہم عامہ یا عقل سلیم تحقیقی آلات نہیں ہیں کیونکہ وہ محدود ہوتے ہیں۔

۱۲۔محض کسی کا حوالہ دینا سند نہیں ٹھہر سکتا۔

منطقی استدلال دوسرا مرحلہ ہے جس میں اپنے فرضیے کے حق میں موجود شواہد کے علاوہ اس کے مخالف شواہد کو بھی تحقیق میں شامل کیا جاتا ہے۔اس طرح تحقیق ایک دہرا عمل قرار پاتی ہے جو اپنے موضوع کے خلاف بھی جا سکتی ہے۔

استدلال کی منطق عام طور پر دو طریقوں سے انجام پاتی ہے:

(الف) استخراج (Deduction)

(ب) استقرا (Induction)

استخراجی طریقہ کسی اہم اور معروف امر سے کسی نئے امر کے بارے میں نتیجہ نکالنا اور استقرائی طریقہ بہت سے عوامل سے نتائج اخذ کرنے کا عمومی اصول ہے۔ تحقیقی بنیادوں میں ان دونوں طریقوں کو دخل حاصل ہے لیکن تحقیق ذرا ان دونوں سے بڑھ رہے۔ جب ہم فرضیے (Hypotheses) منتخب کرتے ہیں تو استخراج سے کام لیتے ہیں اور جب ان کی صداقت معلوم کرتے ہیں تو استقرائی طریقے پر عمل کرتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ ہم زیادہ سے زیادہ شواہد (حق اور مخالفت میں) جمع کرتے ہیں، ہم اپنے تحقیقی نتائج کو حتمی قرار نہیں دیتے بلکہ اپنی حدود کار دوسروں کے سامنے رکھ دیتے ہیں تا کہ وہ دیکھ سکیں کہ ان حدود کے اندر ہم کس دلیل کے ساتھ کیا بیان کر رہے ہیں۔ چونکہ کوئی استخراج اور استقراء ہمیشہ درست نہیں ہوتا اور ہم تمام مثالوں تک سو فی صد پہنچ کر نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے۔ اس لئے ایک نمونہ جاتی طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ چونکہ منطق جلد بازی سے عمومیت یعنی عمومی اصول وضع کرنے کی کوشش کرتی ہے اس لئے تحقیق اس تعمیم کو بھی پرکھتی ہے۔ پھر اپنے نتائج کو بھی محض عبوری (Tentative) قرار دیتی ہے حتمی نہیں۔ یعنی تحقیق میں دعویٰ (Thesis) تو کیا جاتا ہے ادعا (Dogma) نہیں۔ اس ضمن میں مابعد اثباتیت کا نقطہ نظر ہم جان چکے ہیں۔

تحقیق کے مدلل بیان میں ضروری ہے کہ پیش کش واضح اور منطقی ربط کے ساتھ کی گئی ہو۔ خطابات، صفات، تشبیہ، استعارے اور مجازی زبان استعمال نہ کی جائے۔ بات سیدھے سادے انداز میں بیان ہو۔ مثبت جملے اختیار کئے جائیں۔ یاد رہے کہ دعویٰ نتائج کو دوسروں تک منتقل کر کے بھی معروضی طور پر وہی ماحصل دکھاتا ہے جو تحقیق کار کو دعویٰ تو پیش کرنے ہوں گے کہ انہیں پرکھا جا سکے لیکن کسی قسم کے حتمی ادعا سے گریز کرنا چاہئے۔

موجودہ ادبی ولسانی مقالوں میں عام طور پر اسناد کو محض حوالے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور مختلف متفرق حوالوں کے اجتماع کو تحقیقی جائزے کا نام دے کر سمجھ لیا جاتا ہے کہ ادب یا زبان میں تحقیق کا فریضہ انجام دے لے گیا ہے۔ یہ رویہ نظر ثانی کا محتاج ہے۔

تحقیق ایک جزوی، یک طرفہ یا محض تجزیاتی نہیں بلکہ ایک کلی (Holistic) عمل ہے۔ بیسویں صدی کے اواخر میں تحقیق کو محض ''علم کی تخلیق بذریعہ تفتیش'' سمجھا گیا تھا اور سائنسی نقطہ نظر کے حوالے سے اسے محض ایک قواعد کار اور تکنیک گردانا گیا تھا۔ یہ امور اثباتیت (Positivism) پر فلسفے کے تحت وضع ہوتے تھے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں مابعد اثباتیت کے فروغ سے دنیا کہیں سے کہیں جا پہنچی۔ اردو کی ادبی تحقیق ابھی اثباتیت کی حدود کو نہیں چھو رہی۔ اس لئے شاید مابعد اثباتیت کی بات کرنا کارے دارد ہے۔ اثباتیت میں دنیا اور اس کی فطرت کو حسیاتی بنیادوں پر سمجھنے کی کوشش کی گی، جبکہ مابعد اثباتیت میں دنیا کی کثیر حقیقی بنیادوں کو سامنے لایا گیا ہے۔ چنانچہ حسیاتی کے بجائے اسے کلی اور وجدانی ٹھہرایا گیا۔ اس لئے تحقیق کار جہاں اثباتیت میں معروضی ہوتا ہے، مابعد اثباتیت کے نقطہ نظر سے موضوعی بھی ہوتا ہے۔ اس کا طریق کار استخراجی فرضیوں سے نکل کر استقرائی دریافتوں تک چلا آتا ہے۔ یوں مقداری تحقیق معیاری تحقیق میں بدلنے لگتی ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج کی تحقیق ان ہر دو فلسفوں کے امکانات کو سامنے رکھتی ہوئی کلی طریق کار استعمال کرتی ہے۔ یہ روش ادبی تحقیق میں ہمارے زیادہ کام آتی ہے۔

یہاں پر ادبی تحقیق کے تعلق سے ایک بات صاف کرنا ضروری ہے کہ اب سے چند سال پہلے ہمارے مشرقی ادب میں فنی صحت اور زبان و بیان کی درستگی پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ اگر کسی شاعر نے کوئی لفظ یا ترکیب خلاف محاورہ استعمال کی یا اس سے بحر و قافیہ کی چھوٹی سی بھول ہوئی تو اس کی شاعری کو ادبی حلقوں میں پسند نہیں کیا جاتا تھا اور لوگ اس کو ٹکسال باہر سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں بدقسمتی سے ہمارے ملک میں متوازن راستہ اختیار نہیں کیا گیا۔ یہ لوگ صرف اس قدر ضروری خیال کرتے تھے کہ الفاظ میں فصاحت ہے، محاورہ درست ہے، بندش چست ہے، معنی و بیان کی رعایت اور مناسبت ہے۔ ہم یہاں صرف ایک رسالہ 'طومار اغلاط' مصنفہ انسخ شاگرد نساخ سے جس میں مشہور اساتذہ لکھنؤ ناسخ، آتش، وزیر، منیر وغیرہ کی اغلاط جمع کی گئی ہیں۔ جس میں شعر کے اصل مفہوم سے قطعاً بحث نہیں کی گئی ہے محض الفاظ اور تراکیب پر زور دیا گیا ہے۔ قدیم نقاد اس کی پروا نہ کرتے تھے کہ ادیب یا شاعر نے جو کچھ لکھا ہے وہ کس ماحول میں لکھا وہ کون داخلی یا خارجی محرکات (Internal and External motives) کے زیر اثر تھا اور اس کے ذہنی اندازک اتدریجی ارتقا کس طریقہ پر ہوا۔ وہ دوسروں سے کس حد تک متاثر ہوا اور اس نے دوسروں کو کس درجہ متاثر کیا۔

جب سے ہمارے ملک میں مغربی علوم کا رواج ہوا اور جدید تنقید مقبول ہوئی، اس وقت سے ہمارے تنقید نگار فن کے تقاضے سے بے پروا ہو کر ادب کے نفسیاتی پہلو پر زیادہ زور دینے لگے اور زبان و بیان کی طرف سے عام طور پر بے پروائی برتی جانے لگی۔ چنانچہ پروفیسر احتشام حسین ترقی پسند ادب کی نسبت لکھتے ہیں:

''ترقی پسند ادب کا زاویۂ نظر مواد اور ہیئت کے تعلق کے بارے میں بہت واضح ہے۔ وہ تمام شعرا اور نقاد جو زندگی کو نامیاتی مانتے ہیں جو مقدار سے خصوصیتوں کو بدلنے کے قائل ہیں جو شاعری کو زندگی کا مظہر مانتے ہیں۔ جو ادب کو سماجی ترقی کا ایک آلہ سمجھتے ہیں۔ اور جو تمدن کو عام کرنا اور فنون لطیفہ کو عوام کی چیز بنانا چاہتے ہیں وہ کسی حالت میں بھی ہیئت اور اسلوب کو مواد پر اہمیت دینے کے لے آمادہ نہیں ہو سکتے۔''

یہ بالکل صحیح ہے کہ ہیئت کو مواد پر ترجیح نہیں دی جا سکتی مگر مہیئت کو سرے سے نظر انداز کرنا بھی جائز نہیں۔

ہمارے خیال میں دونوں گروہ افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ یہ درست ہے کہ ہم کسی ادیب یا شاعر کو پورے طور پر اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اس کے ماحول اور ذہنی افتاد سے واقف ہوں اور اسی وقت اس کے شاہ کار کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ کر سکتے ہیں مگر فن۔ اس کے قواعد اور زبان و بیان کے اصول کا بھی ایک مقام ہے جس سے صرف نظر صحیح نہیں۔ علامہ شبلی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ عمدہ معانی جو مناسب الفاظ میں ادا کیے جائیں ان کی مثال خالص میٹھے پانی کی ہے جو ایک صاف شیشے کے گلاس میں پیش کیا جائے۔ اس کے برخلاف ایک عمدہ مضمون جو بھونڈے الفاظ میں ادا کیا جائے ایسا ہے جیسے صاف پانی ایک گندے برتن میں ہو، اور ایک برا مضمون جو عمدہ طریقہ سے بیان کیا جائے س کو محض چند مثالوں سے نہیں سمجھا یا جا سکتا۔ یہ تفصیلی بحث چاہتا ہے تاہم ہم کوشش کریں گے کہ مختصراً تنقید کا جائزہ لیں۔ اور ان شرائط کی نشاندہی کریں جو ناقد کے لیے ناگزیر ہیں۔

۱۔ تنقید کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہمارا مطالعہ وسیع ہو۔ اس لیے کہ اگر اس ادب کے سرمایہ پر جو زیر بحث ہے ہماری پوری نظر نہیں تو ہمارا فیصلہ بھی محدود اور تنگ نظرانہ ہوگا۔ جس مطالعہ کی وسعت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس سے ہماری مراد صرف کتابی مطالعہ نہیں ہے بلکہ کائنات کا مطالعہ اور مشاہدہ بھی اس میں شامل ہے۔ محض تخیل پر بھروسہ ناقد کو حقیقت سے دور کر سکتا ہے۔ خود تخیل میں وسعت مطالعہ ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر کسی کا مطالعہ محدود ہے تو اس کی نظر بھی محدود ہوگی۔ جو شخص محض تخیل کا سہارا لے کر مطالعہ کائنات سے نظریں چرائے گا۔ اس کا ذہن صرف چند تشبیہات اور استعارات کی رنگینیوں اور ہیئت کی نادرہ کاریوں میں پھنس کر رہ جائے گا اور اس روح تک نہ پہنچ سکے گا جو کائنات کے اندر پوشیدہ ہے۔ علامہ شبلی نے شعرالعجم میں ایک واقعہ نقل کیا ہے۔

''ابن الرومی عرب کا مشہور شاعر تھا۔ ایک دفعہ اس کو کسی نے طعنہ دیا کہ تم ابن المعتز سے بڑھ کر ہو پھر ابن المعتز کی سی تشبیہیں کیوں نہیں پیدا کر سکتے۔ ابن الرومی نے کہا ان کی کوئی تشبیہ سناؤ، جس کا جواب مجھسے نہ ہو سکا ہو۔ اس نے یہ شعر پڑھا۔

ترجمہ: ''پہلی رات کا چاند ایسا ہے جس طرح ایک چاندی کشتی جس پر اس قدر عنبر لاد دیا گیا ہے کہ وہ دب گئی ہے۔''

ابن الرومی یہ سن کر چیخ اٹھا کہ خدا کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا، ابن المعتز بادشاہ اور بادشاہ زادہ ہے۔ گھر میں جو کچھ دیکھا وہی کہہ دیتا ہے۔ میں یہ خیالات کہاں سے لاؤں۔''

دوسری شرط تخیل کی فراوانی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ناقد زیر بحث ادب پارے کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے لازم ہے کہ اس ذہنی ماحول میں داخل ہونے کی کوشش کرے اور اپنے آپ کو اس پوزیشن میں رکھے جس میں شاعر یا نثار نے اپنے فن کی تخلیق کی تھی۔ اس کے بغیر اس کی رائے کج اور اس کا فیصلہ غیر ہمدردانہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ ممکن ہے کہ تنقید کے ساتھ انصاف کرنا تو درکنار وہ اس تخلیق کو سمجھ بھی نہ سکے۔ اس موقع پر اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ تخیل محض رسمی خیالی تصورات کا نام نہیں ہے بلکہ وہ قوت ہے جو پوشیدہ رازوں کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کا علم اشیا کا اظہار ہی نہیں ہے بلکہ ان پر ناقدانہ نظر ڈالنا بھی ہے۔ تخیل کے استعمال میں ایک احتیاط کا خاص طور پر خیال رکھنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ جہاں اس کے بغیر ہمارا علم نامکمل ہے وہاں اس کی بے اعتدالی ہمارے ادب پارے کو تباہ کر دیتی ہے۔

۳۔ تنقید کے لیے موضوع زیر بحث میں ناقد کا ماہر ہونا لازم ہے۔ ورنہ اس کی تنقید ایک عامی تنقید سے زیادہ وقیع نہ ہوگی۔ شعرالعجم میں ایک واقعہ نقل ہے کہ یونان میں ایک مصور نے ایک آدمی کی جس کے ہاتھ میں انگور کا خوشہ ہے تصویر بنا کر منظر عام پر آویزاں کر دی۔ تصویر اس قدر اصل کے

مطابق تھی کہ پرندے انگور کو اصلی سمجھ کر اس پر گرتے تھے اور چونچ مارتے تھے۔ تمام نمائش گاہ میں غل پڑ گیا اور لوگ ہر طرف سے آ آ کر مصور کو مبارکباد دینے لگے لیکن مصور روتا تھا کہ تصویر میں نقص رہ گیا۔ لوگوں نے حیرت سے پوچھا کہ اس سے بڑھ کر اور کیا کمال ہو سکتا تھا۔ مصور نے کہا کہ بے شبہ انگور کی تصویر اچھی بنی ہے لیکن جس آدمی کے ہاتھ میں انگور ہے اس کی تصویر میں نقص ہے۔ ورنہ پرند انگور پر ٹوٹنے کی جرأت نہ کرتے۔''

کبھی کبھی یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ کیا کسی مجموعۂ شعر پر تنقید کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ناقد خود شاعر بھی ہو۔ اس بارے میں کافی اختلاف رہا ہے مگر ہماری رائے میں یہ ضروری نہیں کہ اس مقصد کے لیے ناقد خود شاعر ہو۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ ادب زیر بحث کے تمام سرمائے سے واقف اور شعر کے حسن و قبح سے باخبر ہو۔

۴۔ ناقد کو غیر جانبدار رہونا چاہئے اس کی تنقید نہ تقریظ ہو اور نہ تنقیص۔

۵۔ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ تنقید کا مقصد رفتار ادب کی ترقی میں رکاوٹ ڈالنا ہے۔ ایک شخص خون جگر کی آمیزش سے ایک فن پارہ وجود میں لاتا ہے اور کمال بے تعلقی سے اس کو مسترد کر دیتا ہے۔ اس لیے تنقید ادب کے لیے ایک مضرت رساں چیز ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ جو تنقید مناسب اصول کے ساتھ کی جائے وہ ادب کے دھارے میں رکاوٹ نہیں ڈالتی۔ بلکہ اس کی موزوں سمت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اگر تنقید نہ ہوتی تو ہر کس و ناکس جو چاہتا لکھ مارتا اور اس کی ادنا سی ادنا تحریر کو ملک کی ادبیات میں سکہ رائج الوقت کی حیثیت حاصل ہوتی اور دنیا سے کھوٹے کھرے کا فرق اٹھ جاتا۔

ہم نے تحقیق اور تنقید کے بارے میں جو کچھ کہا اس سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں دو مختلف چیزیں ہیں جن کے حدود الگ الگ ہیں مگر ایسا نہیں ہے۔ دراصل تحقیق بغیر تنقید کے ناقص ہے۔ کیوں کہ جب تک ایک شخص میں خوب و زشت کا مادہ نہیں وہ محقق نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جب تک کسی ادب پارے کے وجود میں آنے کے خارجی عوامل سے وہ بے خبر ہے اس وقت تک ناقد ہونے کا دعویٰ غلط ہے۔ یہاں پر تحقیق کے بارے میں کچھ اشارے ضروری ہیں جس طرح تنقید کے لیے کچھ شرائط ہیں اسی طرح تحقیق کے لیے چند امور کا ہونا لازمی ہے۔

۱۔ تحقیق کے لیے یہ لازم ہے کہ ہم روایت و درایت کے اصول کو سمجھیں روایت سے ادب کو جدا کرنا ممکن نہیں کسی زبان کا بھی ادب ہو اس نے یقیناً روایت کے سائے میں ترقی کی ہے۔ لیکن روایت ہی کا ہو رہنا اور درایت سے کام نہ لینا جمود کا دوسرا نام ہے۔ علم ہمیشہ شک سے شروع ہوتا ہے اور اسی شک کی راہ سے انسان یقین تک پہنچتا ہے۔ اس لیے ایک طرف ہمارا فرض ہے کہ ادبی شاہ کار کے بارے میں روایتی سرمایہ ہمارے علم میں ہو مگر جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا کہ روایت کا پرکھنا اور اس کے ماخذ کا پتا لگانا ضروری ہے۔ مراد یہ ہے کہ ہم روایت سے بھی استفادہ کریں اور کورانہ تقلید سے بھی بچیں۔

۲۔ محقق کے لئے دوسری شرط ادب پارے کے تاریخ اور زمانے سے واقفیت ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ مصنف کے ماحول اور ماخذ سے پوری طرح واقف ہوں۔

۳۔ تیسری شرط واقعات کی فراہمی کا مسئلہ ہے اور یہ وہ (Data) ہے جس سے وہ کسی نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے گویا یہ واقعات ایک طرح کا (Raw material) ہیں جن سے وہ اپنی ضرورت کے مطابق عمارت تیار کرے گا یا واقعات کی فراہمی میں تجسس اور لگن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور واقعات کا بطور خود مشاہدہ از بس ضروری ہے۔

۴۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ ہمارا کوئی دعویٰ محض قیاس پر مبنی نہ ہو اور ہر دعوے کے ساتھ مضبوط دلیل ہو۔ اس سلسلہ میں یہ ضروری ہے کہ محقق منطقی طرز استدلال سے بیگانہ نہ ہو۔ ہمارا مطلب یہ نہیں کہ اس نے کالج یا یونیورسٹی میں رہ کر باقاعدہ لاجک کی کوئی ڈگری حاصل کی ہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ مختلف واقعات سے صحیح نتیجہ نکالنے والے ذہن کا مالک ہو۔

۵۔ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ تحقیق کا مقصد تلاش حق (Search of truth) ہے جس سے محقق کو ایک لمحہ بھی غافل نہیں رہنا چاہئے۔ بات کو مبالغہ سے بیان کرنا، تعصب اور ہٹ دھرمی سے کام لینا اور اپنے قول کی پچ کرنا حد سے زیادہ مضر ہے۔ ہم کو چاہئے کہ دل و دماغ کو خالی اور صاف رکھیں۔ اور واقعات جس امر خاص کی طرف رہنمائی کریں اس کو قبول کرنے میں پس و پیش سے کام نہ لیں۔

۶۔ ہمیں یہ حقیقت بھی نہ بھولنا چاہئے کہ تحقیق معمولی کاوش کا نام نہیں ہے۔ اس کے لیے ہم کو اپنے تئیں پورے طور پر وقف کر دینا ہوگا اور یہ یاد رکھنا ہوگا کہ تحقیق تقلید کی ضد ہے۔ اس لیے کہ تقلید ذہن کی وسعت اور نظر کی آزادی پر ایک پردہ ہے۔ جب تک اس پردہ کو چاک نہیں کیا جائے گا اس وقت تک تحقیق کی روح تک پہنچنا ممکن نہیں۔ بعض لوگوں نے غلط فہمی کی بنا پر یہ سمجھ لیا ہے کہ اگر محض چھان بین سے چند واقعات یکجا کر دیں تو تحقیق کا فرض انجام پا جائے گا لیکن ہم کو یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ایک اچھے محقق کے لیے ناقدانہ نظر کی بیحد ضرورت ہے۔

علم وفن کے جتنے بھی شعبے ہیں ان میں تحقیق کا عمل جاری ہے۔ اس لحاظ سے تحقیق کی بہت سی قسمیں ہوسکتی ہیں لیکن بنیادی طور پر اسے دو حصوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ ایک خالص نظریاتی تحقیق (Pure research) دوسری اطلاقی تحقیق (Applied research)۔ خالص یا نظریاتی تحقیق کا مقصد معلومات میں اضافہ کرنا ہوتا ہے جبکہ اطلاقی تحقیق معلومات کے اضافے کے ساتھ اپنے نتائج کو عملی شکل میں بھی دیکھتی ہے۔ ادبی تحقیق کا تعلق خالص نظریاتی تحقیق سے ہے۔ ادبی تحقیق کا طریقہ کار تاریخی اور تجزیاتی دونوں نوعیت کا ہوتا ہے۔ مگر زیادہ تر تاریخی تحقیقی سے کام لیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں محققین میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ کچھ محققین ایسے ہیں جو اعداد وشمار جمع کرنا ہی تحقیق سمجھتے ہیں اور کچھ خالص تنقیدی موضوعات کو بھی تحقیق کے ضمن میں رکھتے ہیں اور اسی لحاظ سے ہر ایک نے تحقیق کے دائرۂ کار کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان سب کا جائزہ لینا ہمارا مقصود نہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے تحقیق کا فن میں ہند کے مختلف اہل قلم کی آرا کا جائزہ لینے کے بعد ادبی تحقیق کو مندرجہ ذیل عنوانات پر منقسم کیا ہے:

۱۔ سوانحی یا تاریخی تحقیق۔ ۲ تنقیدی تحقیق۔ ۳ تدوین متن۔ ۴۔ حوالہ جاتی تحقیق۔ ۵۔ بین العلومی تحقیق۔ ۶۔ ادبی لسانیاتی تحقیق۔

(۱) سوانحی یا تاریخی تحقیق:

اس کا اندازہ زیادہ تر تاریخی ہوتا ہے اور کسی ادیب یا شاعر کی پوری زندگی کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ کوئی فنکار کہاں اور کب پیدا ہوا اس کی تعلیم و تربیت کس نہج پر ہوئی، اس کا خاندانی پس منظر کیا رہا، جس دور میں وہ پیدا ہوا اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات کیا تھے اور ان کے کون سے اثرات فنکار کی شخصیت پر مرتب ہوئے ان سب کا جواب تاریخی یا سوانحی تحقیق میں دیا جاتا ہے۔ نیز یہ بھی دکھایا جاتا ہے کہ اس کا تخلیقی عمل کیسے شروع ہوا، اپنے معاصرین سے اس کے تعلقات کی نوعیت کیا ہے، شاعری میں وہ کس کا شاگرد ہے اور اس کی شاعری پر کن کن بڑے شاعروں کے اثرات ہیں وغیرہ۔

سوانحی تحقیق میں کسی فنکار کی حیات کے ساتھ اس کی تصانیف کا تحقیقی جائزہ بھی لیا جاتا ہے۔ اس میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ کسی مصنف کی کون سی تصنیف کب وجود میں آئی اور اس کی تالیف کے اسباب کیا تھے۔ اس کا کلام شائع ہوا یا نہیں۔ اس طرح کی بہت سے بحثیں سوانحی یا تاریخی تحقیق میں کی جاتی ہیں۔ اسی نہج پر کسی ادبی گروہ، طبقہ یا علاقہ پر بھی تحقیقات کی جاسکتی ہیں۔

۲۔ تنقیدی تحقیق:

اس سلسلے میں ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

''یونیورسٹی کے قوانین تحقیق میں جو ایک شق ہوتی ہے پرانے یا معلوم حقائق کی نئی تشریح، اسی کے سایۂ دامن میں تنقید تحقیق کے دامن میں دراندازہو جاتی ہے۔''

اور اس طرح تنقیدی تحقیق کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ تحقیق میں پرانے یا معلوم حقائق کی نئی تعبیر وتشریح کی گنجائش ہے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم تحقیق سے بالکل دامن بچالیں۔ ادبی تحقیق میں تنقیدی شعور سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر تحقیق اور تنقید کی ہم آہنگی سے کام لیا جاتا ہے تو اسے تحقیق کے ضمن میں رکھا جاسکتا ہے۔ محض اقدار وتصورات کی تعبیر وتشریح کو تحقیق کے دائرے میں رکھنا مناسب نہیں۔ اس سلسلے میں کسی صنف، تحریک اور دبستان پر تحقیقی کام کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ تدوین متن:

تدوین متن یا متنی تحقیق میں کسی متن کے مختلف نسخوں کی فراہمی، ان کا باہم موازنہ، صحیح متن کی ترتیب، متن کے زمانہ تصنیف وتالیف کا تعین اور مصنف کے حالات وغیرہ پر روشنی ڈالتے ہوئے خالص غیر الحاقی مرتن مرتب کرنا تدوین متن کے ضمن میں آتا ہے۔ اس پہ تفصیلی روشنی آگے ڈالی جائے گی۔

۴۔حوالہ جاتی تحقیق:

اس میں تاریخی اور تجزیاتی دونوں طریقہ کار سے کام لیا جاسکتا ہے۔اس میں عام طور پر اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ یہ تحقیق آئندہ محققین کے لیے زیادہ سے زیادہ ممد ومعاون ثابت ہو۔اس میں حقائق کو یکجا مدون ومرتب کر دیا جاتا ہے۔سوانحی قاموس، وضاحتی فہرستیں اور اشاریہ وغیرہ کو اس میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

۵۔بین العلومی تحقیق:

اس میں ادب اور دوسرے علوم کے مشترک موضوعات پر تحقیقی کام کیا جاسکتا ہے۔اس میں ایک ادب کا دوسرے ادب سے تقابلی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔اس کے علاوہ دیگر علوم سے رشتہ قائم کر کے کام کیا جاسکتا ہے۔مثلاً ادب اور لسانیات، ادب اور فلسفہ، ادب اور نفسیات، ادب اور مذہب، ادب اور موسیقی، ادب اور تاریخ، ادب اور سیاست، ادب اور صحافت، ادب اور سماجیات، ادب اور شہریات، ادب اور معاشیات، ادب اور قانون اور ادب اور سائنس وغیرہ۔

۶۔ادبی لسانیاتی تحقیق:

اس میں کسی ادیب کا لسانی مطالعہ، کسی کتاب کا لسانی مطالعہ، زبان کا آغاز وارتقا، لغات، فرہنگ، قواعد، اصطلاحات، املا، صوتیات، لفظیات اور زبان کی اصلاح اور معیار بندی جیسے موضوعات رکھے جاسکتے ہیں۔

تحقیق ادبی ہو یا کسی اور نوعیت کی بہر حال اس کا مقصد کسی شے کی اصل حقیقت کا پتہ لگانا ہوتا ہے مگر اس سلسلے میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ذرا سی بے احتیاطی حقیقت کے چہرے کو گرد آلود کر سکتی ہے۔چنانچہ جب تحقیق کا سلسلہ شروع کیا جائے تو اس بات کا خیال رہے کہ جو مواد پیش کیا جارہا ہے وہ کتنا معتبر ہے۔کسی بھی بات کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کے سلسلے میں ماخذ کی بنیادی اہمیت ہے۔اگر ماخذ معتبر ومستند ہے تو تحقیق بھی معتبر ہوگی۔اگر مشکوک ماخذ سے کام لیا گیا تو تحقیق بھی مشکوک قرار پائے گا اور غیر مستند ماخذ سے کام لیا گیا تو تحقیق پایہ اعتبار سے ہی گر جائے گی۔اسی بات پر زور دیتے ہوئے رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''جن امور پر استدلال کی بنیاد رکھی جائے وہ اس وقت تک معلومات کے مطابق، بظاہر حالات شک سے بری ہوں اور جن ماخذ سے کام لیا جائے وہ قابل اعتماد ہوں۔غیر متعین مشکوک اور قیاس پر مبنی خیالات کا مصرف جو بھی ہو ان کی بنیاد پر تحقیقی نقطہ نظر سے قابل قبول نتائج نہیں نکالے جاسکتے۔''[۱۰]

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ادبی تحقیق کا ایک اہم حصہ تدوین متن بھی ہے۔تدوین متن سے مراد ہے متن کی کما حقہ تصحیح۔اور متن کی کما حقہ تصحیح کا مطلب ہے کسی تحریر کو منشائے مصنف کے مطابق پیش کرنے کی بھرپور کوشش۔مرتب کو یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ مصنف نے کسی متن کو کس طرح لکھا ہے۔اگر کوئی تحریر بار بار شائع ہوئی ہے یا اس کے بہت سے مخطوطے موجود ہیں یا کسی تحریر پر مصنف نے بار بار نظر ثانی کی ہے تو مرتب کا یہ فرض ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ آخری بار مصنف نے عبارت کس طرح لکھی تھی۔کتابت کی غلطیوں اور بعض صاحبان ذوق کی اصلاحوں کی وہ سے بھی متن کی صورت بگڑ جاتی ہے۔اصل متن کو صحیح طریقے سے پیش کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مرتب قدیم املا، مصنف کی علمی سطح اور ادبی ذوق، اس زمانے کے عام علمی مذاق اور مصنف کی دوسری تحریروں سے بھی واقف ہو جب ہی وہ دودھ اور پانی کو الگ کر سکتا ہے۔حالی نے مقدمہ شعر وشاعری میں لکھا ہے کہ شاعر کو ایک ایک لفظ کی تلاش میں ستر ستر کنویں جھانکنے پڑتے ہیں۔خاکسار کو یہ عرض کرنے کی اجازت دی جائے کہ مرتب متن کو ایک ایک لفظ کی تلاش میں بہت سے موقعوں پر ستر کنویں جھانکنے کے بعد بھی

کامیابی نہیں ملتی۔اسے کئی کئی مہینے بلکہ برسوں ایک چھوٹی سی گتھی کو سلجھانے میں لگ جاتے ہیں۔ہزاروں صفحات کو پلٹنے، درجنوں لغت کے اوراق الٹنے، بڑے بڑے علمائے لسانیات سے رابطہ کرنے اور غور وفکر کے دریا بے کنار میں ہزاروں غوطے کھانے کے بعد ایک ذرا سی سطر کے صحیح متن کا تعین ہو پاتا ہے۔پروفیسر نورالحسن نقوی مرحوم جب مصحفی کے دواوین مرتب کر رہے تھے تو میں نے اپنی آنکھوں سے ان کی بے چینی دیکھی۔

میں نے وہ خطوط بھی دیکھے جو اس زمانے کے مشہور محققین اور علمائے ادب نے انہیں ان کے خطوں کے جواب میں لکھے تھے۔اکثر خطوں میں یہ لکھا ہوتا تھا کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لفظ کس طرح ہے؟ غور کر رہا ہوں گتھی سلجھ گئی تو پھر خط لکھوں گا۔بعض نامور محققوں کے ایسے مراسلے بھی خاکسار کی

نظر سے گزرے جن میں انہوں نے اپنی رائے سے رجوع کیا تھا ور لکھا تھا کہ میری پہلی رائے غور وفکر کے بعد مجھے غلط معلوم ہورہی ہے۔مزید غور وفکر کی ضرورت ہے۔

اتنی محنت کے بعد ایک متن مرتب ہوتا ہے۔محنت، مستقل مزاجی، مسلسل غور وفکر، صحیح اور غلط کو پرکھنے کی صلاحیت، قوت فیصلہ، دوسروں سے بار بار پوچھنے، مشورہ کرنے اور اپنی غلطیوں کو تسلیم کر لینے کا حوصلہ جن کے پاس ہے ترتیب متن کے میدان میں وہی قدم رکھ سکتے ہیں۔ترتیب متن کا کام ہمیں ہماری اوقات بتا دیتا ہے اور ہم جان جاتے ہیں کہ دوسری زبانوں کے ادب پر عبور حاصل کرنا تو بہت دور کی بات ہے اپنی زبان کو بھی اچھی طرح سمجھنے کے لئے ایک عمر چاہئے۔اس لیے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ تنقیدی اصطلاحوں اور فلسفیانہ موشگافیوں میں الجھنے سے پہلے ہم اور ہمارے طلبا اپنی زبان کے ادب عالیہ کو دل لگا کر پڑھ لیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم کلاسیکی متون کو صحیح ڈھنگ سے مرتب کر کے اردو کے عام قارئین تک پہنچا دیں۔

تدوین متن میں چونکہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر عبارت یا شعر کی تصحیح کی جاتی ہے اس لیے حواشی میں ان نسخوں کے اختلافات یا بعض دوسری باتوں کی نشاندہی ضروری ہے۔حواشی کے علاوہ فرہنگ سازی کی بھی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔مقدمہ میں کتاب کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں اور مصنف کے حالات زندگی وغیرہ کا ذکر بھی ہونا چاہئے۔بعض لوگوں نے بہت طویل طویل مقدمے لکھے ہیں۔لیکن خاکسار کی رائے یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے اختصار سے کام لینا چاہئے۔ضروری باتوں کو ہی لکھنا چاہئے۔ بلکہ رشید حسن خاں صاحب تو مقدمے میں تنقیدی بحثوں کو شامل کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ان کا خیال ہے کہ:

''تنقید اور تدوین دو الگ الگ موضوع ہیں۔دونوں کے دائرے بھی الگ الگ ہیں۔عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے اور دیکھا گیا ہے کہ اس خلط مبحث سے یعنی مقدمہ کتاب میں مفصل تنقیدی مباحث کو شامل کرنے سے یہ بڑا نقصان ہوتا ہے کہ دونوں کا حق ادا نہیں ہو پاتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ متعلقات متن کی ضروری تفصیلات زیر بحث نہیں آپاتیں۔مرتب کا کام یہ ہے کہ وہ متن کو ممکنہ حد تک صحت کے ساتھ ترتیب دے اور اس متن سے متعلق بحثوں کو مناسب تفصیل کے ساتھ لکھے جس میں زیادہ حصہ زبان اور بیان سے متعلق توضیحات اور تشریحات کا ہوگا۔اس کے فرائض میں یہ شامل نہیں کہ تنقیدی رائے بھی دے۔''